میر کی عشقیہ شاعری کے چند پہلو

ڈاکٹر محمد ساجد خان*

Abstract:

This article seeks the major / salient features of Mir Taqi Mir, love poetry; Mir has translated the multidimensional love experience of life in to his creative expression. Mir has shown physical experience alongwith metaphysical love. His poetry reflects this experience with a multifold expression and narrates the different shade of it.

دنیا بھر کی زبانوں کے ادب و شاعری میں عشق کا موضوع سب سے اہم مقام کا حامل قرار دیا جاتا ہے اور کیوں نہ ہو کہ انسانی جذبوں اور رشتوں میں جذبۂ عشق سے نرالا، انوکھا اور البیلا جذبہ ہے ہی نہیں بلکہ بسا اوقات تو یہ پوری انسانی شخصیت کا اشاریہ بن جاتا ہے۔ ''عشق تو سب ہی کرتے ہیں لیکن یہ بھی کیسی عجیب بات ہے کہ کوئی دو آدمی عشق ایک طرح نہیں کرتے بلکہ عشق ہی سے تو انسان پہچانا جاتا ہے اور عشق ہی تو انسان کی پوری زندگی پر اثر انداز ہو کر اس کی علامت بن جاتا ہے۔''(۱)

میر غزل کے شاعر ہیں اور غزل کی شاعری بنیادی طور پر حسن و عشق کی شاعری ہوتی ہے۔ موضوع سے الگ بھی اس صنفِ سخن کا اُسلوب جہانِ عشق سے ہی استعارے اور رموز مستعار لیتا ہے۔ یوں کہا جائے کہ غزل کی زبان اور اُسلوب عشق کے پیرایہ بیان سے عبارت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ ممکن ہے میر کو خدائے سخن ماننے میں کچھ سخن

* شعبۂ اُردو، بہاء الدین زکریا یونیورسٹی، ملتان

فہم اور کچھ غالب کے طرفدار گریز کریں کہ اس خطاب سے اُن کی مراد سب سے بڑا یا سب سے اچھا شاعر ہو لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ میر بہت بڑے غزل گو اور عشقیہ شاعری کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ بلاشبہ میر کی ایسی عشقیہ شاعری اُردو شعر کی روایت میں بشمول غالب کسی اور سے نہ ہو سکی۔ میر کو اس دنیا کی بہت زیادہ چیزوں سے دلچسپی نہیں، نہ ہی انہیں خود کو صوفی یا حکیم کہلوانے کا کوئی خبط ہے انہوں نے تو اپنی زندگی کا محور و مرکز عشق اور عشق کی بوقلموں کیفیات اور معاملات ہی کو قرار دے لیا تھا۔

عشقِ خوباں کو میرؔ میں اپنا قبلہ و کعبہ و امام کیا (۲)

میرؔ کی ذات اور حیات کے روایتی اور غلط تاثر کے برعکس یہ درست ہے کہ میر نے بہت مصروف، متنوع اور بعض کے نزدیک ہنگامہ خیز زندگی گزاری لیکن ان کی شاعری کے مطالعے سے جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ یہی کہ انہوں نے زندگی بھر بس دو کام کیے ایک شاعری اور دوسرا عشق۔ عشق میر کے لیے زندگی میں ایک مسرت ایک غم ایک سکھ یا دکھ کا نام نہیں بلکہ یہ زیست ہی ان کے یہاں عشق کا بدل ہے۔ بقول پروفیسر کرار حسین ''درویش میر کی زندگی کا غالب جذبہ عشق ہے اور اسی جذبے کے حوالے سے زمانے کی نیرنگیوں کو دیکھتے ہیں۔ غالب کے لیے زمانے کی گوناگوں نیرنگیوں میں نظر اور قلب کی ایک نیرنگی عشق بھی ہے۔ میر کے لیے تو ''دُنیا کی سیر محبت میں ہوگئی'' اور غالب کے لیے دنیا کی سیر میں محبت بھی ایک اہم اور دلچسپ منزل ہے۔ میر کو عشق کے علاوہ کسی اور شغل کی فرصت نہیں۔ غالب کو آستانۂ یار پر دھونی زمانے کے لیے فرصت چاہیے۔'' (۳)

ہمارے عہد کی تنقیدی بصیرت کا اس بات پر اصرار بڑھ رہا ہے کہ میر کی شاعری کو ان کی آپ بیتی کیوں تصور کیا جائے؟ آخر یہ جگ بیتی کیوں نہیں ہو سکتی؟ اس میں تو شبہ نہیں کہ شاعری سوانح عمری نہیں ہوتی لیکن شاعر اور بالخصوص غزل کے شاعر کے ہاں تخیلی تجربات کا خمیر بنیادی طور پر انہیں واقعات سے اُٹھتا ہے جنہیں اس نے اپنے قلب و جان پر سہا اور محسوس کیا ہو اور اس حوالے سے ذاتی تجربہ اور ذاتی زندگی اولیت کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ بہرحال میرؔ نے شعر کے پردے میں اپنا دردِ دل سنایا ہو یا ہم نشینوں کا، اسی درد کے مجموعے کو دیوان کہتے ہیں۔ وہ دکھ درد اُن کے ہوں یا اُن جیسے دوسرے انسانوں کے اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں میر کی عشقیہ شاعری میں افسانوی ادب کی سی واقعیت اور اصلیت ہر جگہ دکھائی دیتی ہے ان کی شاعری میں ہمیں ایک جیتا جاگتا کردار اپنی بہت سی مختلف اور متنوع خصوصیات کے ساتھ، انسانی نوعیت کا یہ معاملہ (عشق) اپنے جیسے دوسرے انسان سے کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری سے اس عاشق کا ایک بہت مفصل اور بہت ہمہ گیر قسم کا کردار وضع اور اخذ کیا جا سکتا ہے۔ داستان یا ناول کا کردار نہ ہوتے ہوئے بھی اس کردار کی شکل و شباہت اور اعمال و افعال بہت مانوس، بہت

دیکھے بھالے سے معلوم ہوتے ہیں اور اس کردار کی وجہ سے میر کی شاعری میں عشقیہ معاملات روزمرہ کی سطح پر وقوع پذیر ہونے والے واقعات کی طرح عمومیت کا پہلو لیے نظر آتے ہیں۔ میر کی اس خصوصیت کے حوالے سے پروفیسر حسن عسکری نے اپنی کتاب ''انسان اور آدمی'' میں لکھا۔''میر کی روحانی کشمکش کا ماحصل یہی ہے کہ اعلیٰ ترین زندگی کو عام ترین زندگی سے ہم آہنگ بنایا جائے۔اس اعلیٰ ترین زندگی کا نام ان کے یہاں عشق ہے۔وہ عشق کو دنیا کے معمولات سے الگ نہیں رکھنا چاہتے بلکہ ان میں سمو دینا چاہتے ہیں۔میر کا عاشق زندگی میں سینکڑوں انسانی رشتوں کے اثرات اپنی طبیعت پر لیے ہوئے محبوب کی طرف مائل ہوتا ہے۔

مصائب اور تھے پر دل کا جانا　　عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے'' (۴)

اس باب میں عسکری صاحب کے خیالات کا خلاصہ یہ ہے کہ میر کی شاعری کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عاشق دنیا جہان سے مختلف کوئی بہت انوکھی شے نہیں وہ مختلف تو ہے لیکن اس میں اور دنیا والوں میں مغائرت کی کوئی خلیج حائل نہیں ہے ان کے کلام میں دوسرے لوگ عاشق سے بے پایاں ہمدردی رکھتے ہیں اس کی زندگی جس نویت کی حامل ہے اس کا احترام کرتے ہیں خود اس کی تقلید کرنے کی ہمت نہیں رکھتے مگر اس کا درجہ پہچانتے ہیں

جی میں تو ہے کہ دیکھیے آوارہ میؔر کو　　لیکن خدا ہی جانے وہ گھر میں ہو یا نہ ہو (۵)

نہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں　　کھینچیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں (۶)

میؔر کے عاشق کا رویہ عام انسانوں سے مغائرت کا نہیں اور عام انسان بھی یونہی لگتا ہے جیسے میر کی صحبت سے فیض اُٹھانا چاہتے ہیں۔اگرچہ اُنہیں اس بات پر کچھ کچھ حیرت ہوتی ہے کہ میر ایسے لوگ کچھ عجیب سے ہو جاتے ہیں لیکن توجہ طلب امر یہ ہے کہ اس عاشق کے کردار کو بھی اس بات پر قدرے حیرت بلکہ بعض اوقات تو افسوس ہوتا ہے کہ وہ دوسروں سے مختلف کیوں ہے؟اس اختلاف کے باوجود ہم اہلِ دنیا اور عاشق کے درمیان ایک انس اور موانست موجود پاتے ہیں۔اس کی شخصیت اہلِ دنیا پر اور اہلِ دنیا اس پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کی بھرپور کوشش بھی کرتے ہیں۔

میر صاحب رلا گئے سب کو　　کل وے تشریف یاں بھی لائے تھے (۷)

میر کی عشقیہ شاعری کی یہی انسانی فضا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں چارہ گر بھی محتسب صفت نہیں ہوتے۔وہ میر کی روحانی کیفیت کو سمجھتے ہیں اسے عشق کی راہ سے باز بھی نہیں رکھنا چاہتے کیونکہ وہ اسے اعلیٰ ترین زندگی کا مظہر مانتے ہیں مگر میر کی تکلیفیں نہیں دیکھی جاتیں۔اس لیے اس طرح شفقت سے سمجھاتے ہیں جیسے کوئی

ماں یا بڑی بہن سمجھاتی ہے۔ وہ اس انداز سے نصیحت کرتے ہیں جیسے خود بھی ان تجربات سے واقف ہوں یا میر کے ساتھ خود ان کا بھی دل دکھ رہا ہے۔

ضعف بہت ہے میر تمہیں کچھ اس کی گلی میں مت جاؤ (۹)

صبر کرو کچھ اور بھی صاحب طاقت جی میں آنے دو

قامت خمیدہ ، رنگ شکستہ ، بدن نزار ترا تو میر غم میں عجب حال ہو گیا (۹)

دانستہ اپنی جی پر کیوں تو جفا کرے ہے اتنا بھی میرے پیارے کوئی کڑھا کرے ہے (۱۰)

اسی عاشق کے ساتھ چارہ گروں کا برتاؤ اس حد تک غیر روایتی ہے کہ جب وہ اس عاشق کو انسانی بساط سے بڑھ کر سختیاں اُٹھانے کی روش پر عمل پیرا دیکھتے ہیں تو بس اس حد تک تلخ ہوتے ہیں

پھر بھی کرتے ہیں میر صاحب عشق ہیں جواں اختیار رکھتے ہیں (۱۱)

جب ہوش میں تو آیا اودھر ہی جاتے پایا اس سے تو میر چندے اس کوچے ہی میں جارہ (۱۲)

اور جب میر کے عاشق پر نصیحتوں کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو پھر بھی لوگوں کے لہجے میں تلخی نہیں آتی بلکہ انہیں ایک گونا اطمینان ہوتا ہے کہ عاشق کی زندگی جس طرح مکمل ہو سکتی تھی اس کا قرینہ نکل آیا۔

آتے کبھو جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس
آخر کو میؔر اس کی گلی ہی میں جا رہے (۱۳)

اگر اس عاشق کی موت دوسروں کے لیے عبرت کی چیز بنتی ہے تو اس طرح نہیں کہ اچھا ہوا اسی قابل تھا بلکہ اس وجہ سے کہ ایسی تکلیفیں اُٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔

نظر میؔر نے کیسی حسرت سے کی بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد (۱۴)

غرض میر کے اس عاشق کے لیے دنیا میں اور دنیا والوں کے درمیان جگہ موجود ہے۔ میر کے لیے عشق عام انسانی تعلقات سے الگ کوئی چیز نہیں بلکہ انہی کی لطیف اور رچی ہوئی شکل ہے۔ چنانچہ ان کی شاعری میں عاشق کا کردار جب محبوب سے توجہ کا طالب ہوتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے جذبات میں اوروں سے زیادہ شدت اور گہرائی ہے یا وہ توجہ کا زیادہ مستحق ہے بلکہ انسانی تعلقات کے رشتے سے۔

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا (۱۵)

وجہ بیگانگی نہیں معلوم تم جہاں کے ہو واں کے ہم بھی ہیں (۱۶)

میر کی شاعری کے اس پہلو سے بحث کرتے ہوئے حسن عسکری نے لکھا ہے کہ ''غرض اعلیٰ ترین زندگی اور عامیانہ ترین زندگی میں جو خلیج ہے میر نے اپنی شاعری میں اسے پاٹنے کی کوشش کی ہے۔ان کے یہاں نہ تو عام آدمی اتنا بے حس ہے کہ عاشق سے دشمنی یا مغائرت برتے نہ عاشق اتنے جلے تن کا اور حال مست ہے کہ کسی کو خاطر ہی میں نہ لائے ان کے یہاں آدمی اور عاشق الگ الگ مخلوق نہیں ہیں۔زندگی عام آدمی کی سطح سے آہستہ آہستہ بلند ہو کر لطافت، معصومیت، شدت، گہرائی اور گیرائی کی اس سطح تک پہنچتی ہے جس سے عاشق مراد ہے۔۔۔میر کے عشق میں بہت سا درد، نرمی، گھلاوٹ، ہمہ گیری انہیں انسانی تعلقات کے طفیل آتی ہے۔''(۱۷)

اپنی ایک اور کتاب ''وقت کی راگنی'' کے ایک مضمون ''میر جی'' میں حسن عسکری نے ان خیالات کا اظہار کیا ''میر عشق کو (اس سے بہت کچھ مراد ہے) صرف اپنا طرزِ زندگی نہیں سمجھتا بلکہ ایک طرزِ زندگی جسے اس نے اختیار کر لیا ہے اور دوسرے انسان بھی اختیار کر سکتے ہیں۔''(۱۸) بہر حال اس میں تو شک کی گنجائش نہیں کہ میر عاشق سے زیادہ انسان ہے کم سے کم عاشق ہونے کے بعد وہ اپنی انسانیت کو نہیں بھولا۔وہ اپنے ساتھ کوئی مخصوص رعایت نہیں چاہتا جو دوسرے انسانوں سے نہ کی جا سکتی ہو۔وہ محبوب کے سامنے بھی اپنے آپ کو بحیثیت ایک انسان کے پیش کرتا ہے۔محبوب سے شکایت کرتا ہے تو وہ بھی اس طرح جیسے ایک انسان دوسرے انسان سے شکایت کرتا ہے۔

ایسے وحشی کہاں ہیں اے خوباں　　میر کو تم عبث اداس کیا (۱۹)

دُور پھرنے کا ہم سے وقت ہے کیا　　پوچھ کچھ حال بیٹھ کر نزدیک (۲۰)

میر کا عاشق محبوب سے التجا یا سفارش کرتا ہے تو وہ بھی بحیثیت انسان کے:۔

اگرچہ سہل ہیں پر دیدنی میں ہم بھی میرؔ　　ادھر کو یار تامل سے گر نگاہ کریں (۲۱)

میر کا یہ کردار اپنے آپ پر افسوس کرتا ہے تسلی دیتا ہے یا اپنی تعریف کرتا ہے تو وہ بھی خود کو انسان سمجھ کر

خوش رہا جب تلک رہا جیتا　　میر معلوم ہے قلندر تھا (۲۲)

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے　　جان ہے تو جہان ہے پیارے (۲۳)

بے قراری جو کوئی دیکھے ہے سو کہتا ہے　　کچھ تو ہے میرؔ کہ اک دم تجھے آرام نہیں (۲۴)

نہ بھائی ہماری تو قدرت نہیں　　کھنچیں میرؔ تجھ سے ہی یہ خواریاں (۲۵)

''محبوب کی بے اعتنائی کو بھی میرؔ کا عاشق ہمیشہ محبوب کی سخت دلی اور ظلم یا فطری بد کرداری نہیں سمجھتا، ان کے بہترین شعروں میں محبوب بھی انسان ہوتا ہے۔۔۔اگر محبوب بے اعتنائی کرتا ہے تو ضروری نہیں اس کی وجہ کج خلقی، یا اذیت پسندی ہو بلکہ فطری اور انسانی مجبوری بھی ہو سکتی ہے۔بہت ممکن ہے محبوب چاہے بھی اور عاشق پر

مہربانی بھی نہ کر سکے۔ایسی صورت میں عاشق اپنی بدنصیبی پر افسوس تو کر سکتا ہے لیکن محبوب کی شکایت بالکل بے جا ہے۔''(۲۶)

جگر چاکی ، ناکامی دنیا ہے آخر نہیں آئے جو میرؔ کچھ کام ہوگا (۲۷)

ناکام اس لیے ہو کہ چاہو ہو سب کچھ آج تم بھی تو میر صاحب قبلہ عجول ہو (۲۸)

دورِ حاضر میں میر پر معرکتہ الآرا کتاب ''شعرِ شورانگیز'' کے خالق شمس الرحمٰن فاروقی حسن عسکری کی اس بات سے اتفاق نہیں کرتے کہ میر کا عاشق اپنے معشوق سے محبت کا طالب ہی نہیں، صرف انسانی برتاؤ کا طالب ہے اور اس میں وہ وقار ہے جو خوددار انسانوں میں ہوتا ہے۔ فاروقی صاحب کے خیال میں میر کا عاشق اپنے معشوق سے صرف افلاطونی محبت نہیں کرتا بلکہ جسمانی وصل کا طلب گار اور خواہش مند انسان ہے وہ محبوب سے اس نوعیت کے تعلقات نہ صرف رکھتا ہے بلکہ ہجر میں وصل کے لمحات کو شدت سے یاد بھی کرتا ہے۔

میر اور غالب کو چھوڑ کر تمام اُردو شاعری میں عاشق کا ایک روایتی کردار ملتا ہے۔اس کے خواص، عادات، معمولات، عمل اور ردِعمل میں ایک معلوم اور اندازہ کی ہوئی یکسانیت ملتی ہے جب کہ میر اور غالب کی انفرادیت پسندی کے سبب ان کی شاعری میں عاشق کے کردار میں بہت نمایاں تبدیلی ملتی ہے جب کہ بقول شمس الرحمٰن فاروقی: ''میر کے عاشق کی انفرادیت دراصل یہ ہے کہ وہ روایتی عاشق کی تمام صفات رکھتا ہے لیکن ہم اس سے ایک انسان کی طرح ملتے ہیں کسی لفظی رسومیات (Verbal Convention) کے طور پر نہیں۔ یہ انسان ہمیں اپنی ہی دنیا کا باشندہ دکھائی دیتا ہے جب کہ رسومیاتی عاشق کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ بالکل خیالی اور مثالی ہوتا ہے۔''(۲۹)

فاضل مصنف کے خیالات اس موضوع پر اس درجہ وقیع اور خیال افروز ہیں کہ اُن کا ایک خلاصہ پیش کرنا ضروری ہے۔ ہماری دنیا کا یہ انسان محمد تقی میر نہیں ہے اور نہ ہی یہ Fiction کا کوئی کردار ہے کہ اس کے Motivations تلاش کیے جائیں۔ میر کے عاشق سے ہم اس طرح کا کوئی معاملہ نہیں رکھتے بلکہ وہ ان معاملات سے بالاتر اور ماورا ہے یعنی اس کی رسومیاتی حیثیت مسلّم ہے اور اس کے باوجود ہم اس کو عام انسانوں کی سطح پر دیکھتے ہیں اور اصلی انسان کی طرح اس کا تصور کرتے ہیں۔ میر کی یہی زمینی صفت ان کے اسلوب سے تجریدیت کم کر دیتی ہے اور ان کی شاعری کو واقعیت کی سطح پر لے جاتی ہے۔ یہی زمینی صفت ان کے استعاروں اور پیکروں میں ظاہر ہوتی ہے جو محسوسات سے مملو ہیں۔ یہی زمینی صفت انہیں محبوب سے پھکڑ پن کرنے اپنے آپ پر ہنسنے، آپ اپنا مذاق اُڑانے، معشوق پر طنز کرنے کا انداز سکھاتی ہے اسی صفت کی بنا پر میر کی زبان میں فارسی اور اُردو کا غیر معمولی توازن نظر آتا ہے۔ اسی صفت کی بناء پر وہ دنیا اور دنیا کے معاملات میں اس قدر جذب ہیں کہ ان کا صوفیانہ میلان بھی اور کائنات کی عظیم الشان وسعت کا احساس بھی انہیں گوشت پوست کے احساسات سے بے خبر نہیں رکھتا۔ اسی بناء پر وہ

کائنات کے اسرار سے واقف ہونے کے باوجود ان سے خوف زدہ نہیں ہوتے کیونکہ روزمرہ کی زندگی سے ان کا رشتہ مضبوط ہے۔ وہ اس دنیا کے ہیں لیکن اس میں قید نہیں اسی بنا پر وہ انسانی رشتوں کے تعلق سے ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ میر کے پورے کلام سے ایک ایسی شخصیت کا کردار ابھرتا ہے جس نے دنیا کے تمام سچ جھوٹ، دکھ و سکھ، مسرت و غم، تجزیہ و انکشاف کو پوری طرح برتا ہے۔ برداشت کیا ہے یہ شخصیت کسی چیز کے سامنے پست نہیں ہوتی۔ اس نے اتنا کچھ دیکھا برتا اور سہا ہے کہ اس کی روح میں ہر شے نظر آتی ہے۔ اُسے کسی زوال پر کسی عروج پر کسی ہجر پر کسی وصال پر کسی موت پر کسی زندگی پر حیرت نہیں ہوتی۔ یہ شخصیت ہر طرح مکمل ہے اور اس کا پرتو اس عاشق کے کردار پر پڑتا ہے جو میر کے کلام میں جلوہ گر ہے۔

میر کے برعکس غالب کے عاشق کی انفرادیت اس کی رسومیاتی شدت میں ہے۔ میر اور غالب ہمارے دو شاعر ہیں جن کے ہاں عاشق کا کردار غزل کے رسومیاتی عاشق سے مختلف ہے اور اپنی شخصیت آپ رکھتا ہے۔ دونوں نے اس انفرادیت پرست کردار کو خلق کرنے کے لیے اپنے طریقوں سے کام لیا۔ غالب اور میر کا افتراق جتنا اس میدان میں ہے اتنا اور کہیں نہیں ہے۔ میر نے رسومات کی پابندی کرتے ہوئے بھی اپنے عاشق کو انسان کی سطح پر پہنچا دیا۔ غالب نے رسومات کو اس شدت سے برتا کہ اُن کے عاشق کی ہر صفت اپنی مثال آپ ہوگئی۔ اپنے استعاراتی اور محاکاتی تخیل اور اس تخیل کے زمین سے اوپر اُٹھنے اور تجرید پر مائل ہونے کی بنا پر غالب نے عاشق کے خواص و عادات قول و فعل کے ہر رسومیاتی (یعنی خیالی اور مثالی) پہلو کو اس کی منتہائے کمال تک پہنچا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ رشک ہو یا خودداری۔ وفاداری ہو یا نرگسیت، وحشت و آوارگی ہو یا اندر ہی اندر جلنے اور تڑپنے کا رنگ، جنوں و سودا ہو یا طنز و آگہی، شکستِ جسم ہو یا نقصانِ جاں، شوقِ شہادت یا ذوقِ وصل۔۔۔۔ غالب کے یہاں پوری بلکہ مثالی شدت سے ملتی ہیں۔ لہٰذا میر ان کے ایک سرے پر میر ہیں جو عاشق کو انسان بنا کر پیش کرتے ہیں اور دوسری طرف غالب ہیں جو عاشق کو آئیڈیل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ غالب گرمیٔ اندیشہ کی بات کرتے ہیں اور میر اپنے شعر کو زلف سا پیچ دار بتاتے ہیں دونوں کی اساس استعارے پر ہے لیکن غالب کا استعارہ تجریدی ہے اور میر کا استعارہ مرئی۔

ذیل میں چند اشعار درج ہیں جو غالب کے عاشق کو ایک مثالی کردار اور مثالی ہونے کی بنا پر unique ہونے کو ظاہر کرتے ہیں:۔

غالب مجھے ہے اُس سے ہم آغوشی آرزو — جس کا خیال ہے گلِ جیب قبائے گل

بس کہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتشِ زیرِپا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ مری زنجیر کا

سو بار بندِ عشق سے آزاد ہم ہوئے — پر کیا کریں کہ دل ہی عدو ہے فراغ کا (۳۰)

اس صورت سے غالب کے پورے کلام پر اسرار کی فضا موجود ہے۔ ایک نیم روشن دھند ہے جس کو دیکھ کر

جھرجھری سی آجاتی ہے۔ یہاں پر چیز تصور کی ہوئی سی ہوتی ہے۔نظر آئی ہوئی سی نہیں۔ یہاں وہ مبالغہ نہیں ہے جو ہم آپ بیان کرتے ہیں یہاں ہر چیز کو نچوڑ کر اس کے جوہر کو تمام کرۂ ارض پر پھیلایا گیا ہے۔ یہ وہ عالم ہے جس میں بیچارگی بھی بادشاہ وقت کا دبدبہ رکھتی ہے۔ غالب کے علی الرغم میر دنیاوی رشتوں کے شاعر ہیں۔انہوں نے اپنے عاشق کو دنیا میں پیش کرنے کے لیے اور اس کی انفرادیت ثابت کرنے کے لیے اس کے بارے میں بہت سی باتیں خود اس کی زبانی اور دوسروں کی زبان سے کہلوائی ہیں۔ عاشق خود سے گفتگو کر رہا ہو یا معشوق کو موجود فرض کر رہا ہو اس اظہار میں شکایت یا تحسین کا رنگ بہت کم ہوتا ہے اور ہوتا بھی ہے تو مخصوص صورت حال کی بجائے کسی عام صورتِ احوال کے حوالے سے۔ میر کے اس نوعیت کے اشعار میں انکشافِ ذات کا رنگ ہے اور معاملہ رسوماتی حد بندیوں سے نکل جاتا ہے اور انسانی تعلقات کی سطح براہِ راست قائم ہو جاتی ہے۔

عہد کیے جاؤں ہوں اب کی آخر مجھ کو غیرت ہے — تو بھی منانے آوے گا تو ساتھ نہ تیرے جاؤں گا (۳۱)

ویسا کہاں سے ہم سے جیسا کہ آگے تھا تو — اوروں سے مل کے پیارے کچھ اور ہو گیا تو (۳۲)

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے — پچھتاوے گے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر (۳۳)

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں — اِلا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں (۳۴)

درویش ہیں ہم آخر دو اک نگہ کی فرصت — گوشے میں بیٹھے پیارے تم کو دعا کریں گے (۳۵)

ہم فقیروں کو کچھ آزار تمہی دیتے ہو — یوں تو اس فرقے سے سب لوگ دعا لیتے ہیں (۳۶)

دور بہت بھی گو ہو ہم سے دیکھے طریق غزالوں کا — وحشت کرنا شیوہ ہے کیا اچھی آنکھوں والوں کا (۳۷)

مندرجہ بالا اشعار کے لہجے میں تمکنت، خود اعتمادی، اپنی قدر و قیمت کا پورا احساس اور کہیں کہیں المیہ ہیرو کا وقار ہے۔ کہیں کہیں مزاح تو کہیں عام آدمی کی سی تلخی یا چڑچڑاپن ہے۔ کہیں چالاکی اور فریب کاری کا بھی شائبہ ہے لیکن وہ مسکین روتا بسورتا میر جو اُردو نقادوں کے آئینہ خانوں میں جلوہ گر ہے۔ ان اشعار میں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔

کلامِ میر میں ایسے اشعار بھی بڑی تعداد میں ملتے ہیں جن میں عاشق نے معشوق کو برا بھلا کہا ہے۔ جلی کٹی سنائی ہیں یا اس کے کردار پر حملہ کیا ہے۔ ان اشعار میں بھی واسوخت کا رنگ نہیں بلکہ روزمرہ زندگی کے حوالے سے بات کہنے کا انداز ہے۔ میر کو تسلیم و رضا کا پیکر اور مرنجان مرنج عاشق قرار دینے والے نقادوں کو ان اشعار پر غور کرنا چاہیے۔ یہاں میر کا عاشق محبوب کے مقابل جرأت کے ساتھ اس کے اعمال کی سرزنش کرتا ہوا دکھائی دے گا۔

خلاف وعدہ بہت ہوئے ہو کوئی تو وعدہ وفا کرو اب — ملا کے آنکھیں دروغ کہنا کہاں تلک کچھ حیا کرو اب (۳۸)

میر کے بہت سے اشعار جن میں معنوی پیچیدگی کم لیکن ڈرامائی دلچسپی وافر ہے اس انداز کے ہیں کہ کوئی دوسرا

شخص یا بہت سے لوگ معشوق کو اس کے عاشق کی حالت سے مطلع کرتے ہیں یوں لگتا ہے کہ عاشق و معشوق کی باتیں اب اتنی عام ہو چکی ہیں کہ لوگ معشوق کے پاس جا کر میر (عاشق) کے تعلق سے گفتگو کرنا عوامی فریضہ سمجھتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کی کثرت کے سبب: ''میر کے عاشق کی دنیا نہ صرف بہت آباد اور مصروف معلوم ہوتی ہے بلکہ اس کا عشق بھی روزمرہ کی دنیا کے لیے concern اور تردّد کی چیز معلوم ہوتا ہے اور یہ concern یہ تشویش و تردّد یہ لگاؤ خالص انسانی ہے۔ اس میں اخلاقی برتری یا ناصحانہ اصلاح کا کوئی شائبہ نہیں۔ جو لوگ معشوق سے گفتگو کرنے جاتے ہیں وہ سب اس معاملے کو روزمرہ کے معاملات کی سطح پر برتتے ہیں۔ کوئی تصنّع، کوئی تیزی اور کوئی Sentimental Appeal یعنی جذبے کے تقاضے سے زیادہ الفاظ کا استعمال، ایسی کوئی بات نہیں۔''(۳۹)

گیا اس شہر ہی سے میر آخر　　تمہاری طرزِ بد سے کچھ نہ تھا خوش (۴۰)

کیوں کر نہ ہو تم میرؔ کے آزار کے درپے　　یہ جرم ہے اس کا کہ تمہیں پیار کرے ہے (۴۱)

رحم کیا کر، لطف کیا کر، پوچھ لیا کر آخر ہے　　میر اپنا، غم خوار اپنا، پھر زار اپنا، بیمار اپنا (۴۲)

تم کہتے ہو بوسہ طلب تھے شاید شوخی کرتے ہوں
میر تو چپ تصویر سے تھے یہ بات انہوں سے عجب سی ہے (۴۳)

میر کے یہ اشعار عاشق و معشوق کے مابین ایک نیا ربط بلکہ نئی مساوات قائم کر دیتے ہیں۔ اکثر اشعار میں افسانے کی سی کیفیت ہے۔ اس معنی میں کہ اشعار میں جو بات بیان ہو رہی ہے اس سے پہلے بھی کچھ ہو چکا ہے۔ غزل کی دنیا میں معشوق عاشق سے براہِ راست بہت کم ہم کلام ہوتا ہے زیادہ تر عاشق ہی معشوق کی گفتگو بیان کرتا ہے لیکن میر نے عام طریقے کے خلاف عاشق اور معشوق کی براہ راست گفتگو بھی بیان کی ہے۔ معشوق کا لہجہ و الفاظ دونوں عام طور پر تمسخرانہ یا استہزایہ ہوتے ہیں۔

کہنے لگا کہ شب کو میرے تئیں نشہ تھا　　مستانہ میر کو میں کیا جان کر کے مارا (۴۴)

یہ چھیڑ دیکھ ہنس کے رُخ زرد پر مرے　　کہتا ہے میرؔ رنگ تو اب کچھ نکھر چلا (۴۵)

ہوا میں میرؔ جو اس بُت سے سائل بوسہ لب کا　　لگا کہنے ظرافت سے کہ شہ صاحب خدا دیوے (۴۶)

کہنے لگا کہ میرؔ تمہیں بیچوں گا کہیں　　تم دیکھیو نہ کہیو غلام اس کے ہم نہیں (۴۷)

عاشق کی کردار نگاری میں ان اشعار کا بھی بہت بڑا حصہ ہے جن میں عاشق خود کلامی سے کام لیتا ہے یا اپنے حالات کسی دوسرے شخص سے بیان کرتا ہے کیونکہ اس طرح کے تمام اشعار میں گفتگو کا انداز اور روزمرہ کے واقعات کا ذکر ہوتا ہے۔ اس لیے ان میں وہ مخصوص شاعرانہ واقعیت پیدا ہو جاتی ہے جسے شاعری کی افسانویت کا نام دیا جاتا

ہے یعنی یہ بات ہم پہ واضح رہتی ہے کہ ہم کسی اصلی شخص کی گفتگو نہیں سن رہے لیکن جو کہا جا رہا ہے وہ اصلی دنیا ہی سے مستعار ہے۔ مثلاً

ہائے لطافت جسم کی اس کے مر ہی گیا ہوں پوچھو مت جب سے تنِ نازک وہ دیکھا تب سے مجھ میں جان نہیں (۴۸)

بے دل ہوئے بے دیں ہوئے بے قدر ہم ات گت ہوئے بے کس ہوئے بے بس ہوئے بے کل ہوئے بے گت ہوئے (۴۹)

معشوقوں کی گرمی بھی اے میر قیامت ہے چھاتی میں گلے لگ کر ٹک آگ لگا دیں گے (۵۰)

''غالب اور میر کی عشقیہ شاعری کے ذائقے میں جو بات فرق پیدا کرتی ہے وہ یہ کہ غالب کا ذہن اس قدر تصوراتی اور تجریدی ہے کہ معشوق بحیثیت ایک شخص ان کے یہاں بہت کم ہے اور جہاں ہے بھی وہاں بھی تصوراتی پہلو حاوی نہیں تو نمایاں ضرور رہتا ہے۔ عسکری صاحب کو غالب سے شکایت تھی کہ وہ اپنی شخصیت کو پوری طرح ترک نہیں کرتے بلکہ معشوق کے سامنے بھی اپنے آپ کو الگ شخصیت کا حامل قرار دیتے ہیں۔ لہٰذا ان کے ہاں خودسپردگی کی کمی ہے۔ اصل معاملہ یوں ہے کہ تصوراتی اور تجریدی میلان کے حاوی ہونے کے باعث غالب کسی غیر شخص کو (خواہ وہ معشوق ہی کیوں نہ ہو) پوری طرح ظاہر اور بیان نہیں کر سکتے۔ میر کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ہر چیز کو ٹھوس ارضی سطح پر برتتے ہیں لہٰذا ان کے کردار، تصورات سے زیادہ حقیقی اور علامتی سے زیادہ افسانوی معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ معشوق کے بارے میں صیغہ واحد غائب استعمال کرتے وقت بھی اور خودکلامی کے دوران بھی ان کا سارا تاثر کسی موجود شخص کا ہوتا ہے کسی تصور یا علامت کا نہیں۔'' (۵۱)

جوں چشم بسملی نہ مندی آوے گی نظر جو آنکھ میرے خونی کے چہرے پہ باز ہو (۵۲)

میری اس شوخ سے صحبت ہے بعینہ ویسی جیسے بن جائے کسو سادے کو عیار کے ساتھ (۵۳)

میر کی عشقیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے خواجہ احمد فاروقی لکھتے ہیں: ''میر کی محبت خشک روحانیت یا مرطوب ماورائیت کا نام نہیں۔ اس میں تپش اور گرمی ہے۔ انہوں نے اپنی تصویروں میں جن قدروں کو اُبھارا ہے وہ وہی ہیں جو شریف، متوسط گھرانوں میں پائی جاتی تھیں۔ ان میں تمنا کا اظہار، سرشار تجربوں کا نکھار، چاہنے اور چاہے جانے کی آرزو ہے۔ ایک دلربا اصلیت ہے۔ ایک آگہی ہے جو تجربات کی وادی میں سینے کے بل چلنے سے آتی ہے۔ ان کی محبت اصلی اور حقیقی ہے۔ ان کا عشق مادی تقاضوں کا محرم ہے اس میں جنس کی مہک ہے لیکن بڑی بھینی بھینی، بڑی جاں پرور ان کے تہذیبی عوامل نے کثافتوں کو چھانٹ دیا ہے اور اسی جنسی محبت کو حد درجہ لطیف اور رنگین بنا دیا ہے۔ اس میں جو سچائی، پاکیزگی اور ضبط ہے وہ عام شاعروں کی دسترس سے باہر ہے۔'' (۵۴)

ساعد سیمیں دونوں اس کے ہاتھ میں لا کر چھوڑ دیئے بھولے اس کے قول و قسم پر ہائے خیالِ خام کیا (۵۵)

گرچہ کب دیکھتے ہو ، پر دیکھو آرزو ہے کہ تم ادھر دیکھو (۵۶)

بقول احمد فاروقی صاحب میر محبوب سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کرتے جو جارحانہ ہو یا خودداریٔ عشق کے منافی ہو وہ محبوب کے جور وستم کا ذکر بھی کرتے ہیں تو اپنا ہی دل خون کرنے کی حد تک اور عشق کی بلند فتادگی ہر حال میں قائم رکھتے ہیں۔

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے عمر نے ہم سے بے وفائی کی (۵۷)

حالِ بد گفتنی نہیں میرا تم نے پوچھا تو مہربانی کی (۵۸)

حسن عسکری کے یہاں خواجہ احمد فاروقی کے ان خیالات کی بازگشت سنائی دیتی ہے کہ میر کا عاشق محبوب سے کسی مخصوص یا ناممکن رعایت کا طلب گار نہیں، عاشق ہونے کے باوجود وہ انسانیت سے قطع نظر نہیں کرتا اور بارگاہِ محبوب میں جو مطالبہ بھی پیش کرتا ہے وہ عاشق کی حیثیت سے کم اور انسان کی حیثیت سے زیادہ، ملاحظہ ہو۔

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

وصل اس کا خدا نصیب کرے میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

میر کا مطالبہ یہ ہے کہ محبت نہ سہی انسانیت اور مروت کے مطالبات تو پورے ہونا چاہئیں۔

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا چھوڑا وفا کو ان نے مروّت کو کیا ہوا

میر عاشق کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں لیکن انسانی دردمندی کے لہجے میں۔

رات تو ساری گئی سنتے پریشاں گوئی میرؔ جی کوئی گھڑی تم بھی تو آرام کرو (۶۰)

اس عاشق سے یہ انسانی ہمدردی ایک میر ہی نہیں بلکہ تمام عالم کرتا ہے۔

چھوٹا جو میں قفس سے تو سب نے مجھے کہا بیچارہ کیوں کہ تا سرِ دیوار جائے گا

عاشق رحم کا طلب گار ہے اس لیے نہیں کہ وہ عشق کر کے کوئی احسان کرتا ہے بلکہ اس لیے کہ

''عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم''

یہ عاشق جو التجا بھی کرتا ہے وہ بڑے نرم اور دلنشیں انداز میں

دم آخر ہے بیٹھ جا مت جا صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

میر کی شاعری میں عاشق کا یہ کردار کبھی کبھی عشق کے بارے میں بہت فکر انگیز، معنی خیز اور بنیادی اہمیت کی باتیں نہایت واقف کارانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر میر کا عاشق میدانِ عشق کا بہت بڑا راز داں اور نکتہ

شناس دکھائی دیتا ہے۔ وہ عشق کے راستے کی مشکلات کا بیان کرتا ہے اس کے مطابق عشق خانہ ویراں ساز ہوتا ہے۔ یہ انسان کو تباہ و برباد بھی کرتا ہے اور آباد و شاد کام بھی۔ عشق کی چاہ سب کو ہوتی ہے لیکن عشق کرنا محض بے ستوں کاٹنا نہیں، جان دے دینا بھی سہل ہے لیکن عشق بہت مشکل ہے۔ راحت طلبوں کے لیے عشق موزوں نہیں کیونکہ اس میں گام اولین پر جان سے ہاتھ دھونا پڑتے ہیں۔ اس عاشق کے مطابق عشق میں وصل و جدائی کا امتیاز فروعی اور اضافی ہے۔ کبھی کبھی یہ کردار عشق سے عشق کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس کے مطابق عشق حیات و کائنات کی تکوین و آفرینش کا باعث ہوا ہے یہ ناظم کائنات ہے، سارے عالم پر چھایا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ خدا اور رسول سبھی کچھ عشق ہے مختصر یہ کہ اس کردار کی ذات میں ہمیں محبوب کی لات مُکی کھانے سے بے ہراس جان گنوانے اور یاقوتی لب کی آرزو سے لے کر عمر بھر ایک ملاقات کو کافی قرار دینے اور محمل لیلیٰ سے بے نیاز ہو جانے تک _____ عشق کی سبھی طرح کی جلوہ فرمائیوں کی آثار و شواہد ملتے ہیں۔ شاید اسی وجہ سے ناقدین میر نے میر کی عشقیہ شاعری میں اس جذبے کے بے مثال تنوع کا ذکر کیا ہے جس میں عشق کی ارفع ترین صورتوں سے لے کر انسانی ضرورتوں کے نہایت ادنیٰ مظاہروں تک، سبھی شامل ہیں۔ اعلیٰ ترین زندگی کو ادنیٰ ترین زندگی سے ہم آمیز و ہم آہنگ کرنے کی عسکری صاحب والی بات بھی یہی ہے اور جس بات کو میر کی شاعری میں زمینی عنصر کہا گیا اس سے بھی یہی مراد ہے کہ میر کے یہاں عشق کے ذاتی و جسمانی دائرے سے لے کر ایک ہمہ گیر دائرے تک، جس میں پوری کائنات سمائی ہوئی ہے کا تذکرہ بھی میر کے عاشق کے یہاں اسی تنوع اور ہمہ گیری کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

کھیل لڑکوں کا سمجھتے تھے محبت کے تئیں
ہے بڑا حیف ہمیں اپنی بھی نادانی کا

اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

مرے سلیقے سے میری نبھی محبت میں
تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

پوچھا جو میں نے دردِ محبت کو میر سے
رکھ ہاتھ ان نے دل پہ ٹک اک اپنے رو دیا

عشق اک میر بھاری پتھر ہے
کب یہ تجھ ناتواں سے اُٹھتا ہے

عشق میں وصل و جدائی میں نہیں کچھ گفتگو
قرب و بُعد اس جا برابر ہیں محبت چاہیے

روز ملنے سے نہیں نسبتِ عشقی موقوف
عمر بھر ایک ملاقات چلی جاتی ہے

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گام اولیں پر

وہ کیا چیز ہے آہ جس کے لیے
ہر ایک چیز سے دل اُٹھا کر چلے

غمِ فراق ہے دنبالہ گردِ عیشِ وصال
فقط مزا ہی نہیں عشق میں بلا بھی ہے

عشق ہی عشق ہے جہاں دیکھو　　سارے عالم میں بھر رہا ہے عشق
کیا حقیقت کہوں کہ کیا ہے عشق　　حق شناسوں کا ہاں خدا ہے عشق
دل لگا ہو تو جی جہاں سے اُٹھا　　موت کا نام پیار کا ہے عشق
کوہ کن کیا پہاڑ کاٹے گا　　پردے میں زور آزما ہے عشق
کون مقصد کو عشق بن پہنچا　　آرزو عشق ، مدعا ہے عشق
سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں پہ اپنی　　اس خاکِ رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو
پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
موسم آیا تو نخلِ دار میں میر　　سرِ منصور ہی کا بار آیا
مار رہتا ہے اس کو آخرکار　　عشق کو جس سے پیار ہوتا ہے

میر کا یہ عاشق اگرچہ مجنون عاشق ہے لیکن اس مجنوں کے یہاں دیوانگی اور آشفتہ سری کے باوجود ایسا کوئی رویہ نہیں ملتا جسے حسن یا محبوب کی بارگاہ میں بے ادبی پر محمول کیا جا سکے بلکہ عاشق کے یہاں اولیت خود اس کی خواہشات کو نہیں، معشوق کی ذات کو ہے۔ یہ کردار عشق میں اپنی سبھی آرزوؤں کو بیان کرتا ہے اور ان آرزوؤں کی تعبیر کے لیے بے قرار اور مضطرب بھی رہتا ہے لیکن جہاں معاملہ محبوب کے احترام اور لحاظِ آبرو کا آجائے تو عاشق اپنی ہر تمنا سے دستبردار ہو کر پاسِ عزت داری کرنے لگتا ہے۔ ہمیں اس عاشق کے کردار کی بلندی پر قدرے حیرت ہو سکتی ہے لیکن میر نظریاتی سطح پر عشق کی جن اقدار پر ایمان رکھتے ہیں ان کے مطابق عشق شریف ترین اور محترم ترین جذبہ ہے۔ اسی ایمان کی بدولت وہ اپنی آرزوؤں تک پر نظر ثانی کرنے کی ہمت فراہم کر پاتا ہے۔ بعض ناقدین نے میرؔ کے عاشق کو ایک طرح کی مرنجان مرنج شخصیت کا حامل قرار دیا ہے حالانکہ ذیل کے اشعار ثابت کریں گے کہ میر کے عاشق کے یہاں احترام محبوب شخصیت کے اس پہلو کا اظہار نہیں بلکہ یہ اس بلند تر تصور حیات کے نتیجے میں پیدا ہوا ہے، جو ہمیں میر کے مذکورہ اشعار میں ملتا ہے. لہٰذا یہ عاشق محبوب کو روایتی عاشق کے عمومی رویے کی طرح گالی نہیں دیتا اور گلا گھونٹ دینے والی کلبیت اس کے ہاں بالکل نہیں ملتی جب کہ یہ ہماری عشقیہ شاعری کی عام فضا ہے۔ یہاں عاشق محبوب کو بے وفا تک کہنے سے گریز کرتا ہے۔ ایک طرف تو اس عاشق کے یہاں احترامِ محبوب کے یہ انداز ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بطور عاشق کسی طرح کا دعویٰ نہیں کرتا بلکہ میدانِ عاشقی میں اپنی کوتاہیوں پر نظر رکھتا اور یوں عاشق ہونے کا بلند بانگ نعرہ بلند کرنے کی بجائے بس شرما کے رہ جاتا ہے۔

سرزد ہم سے بے ادبی تو وحشت میں بھی کم ہی ہوئی　　کوسوں اُس کی اور گئے پر سجدہ ہر ہر گام کیا
دُور بیٹھا غبارِ میرؔ اُس سے　　عشق بن یہ ادب نہیں آتا

رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے　　جیسے تصویر لگادے کوئی دیوار کے ساتھ

اس کے ایفائے عہد تک نہ جیے　　عمر نے ہم سے بے وفائی کی

پاسِ ناموس عشق تھا ورنہ　　کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

میر سے پوچھا جو میں عاشق ہو تم　　ہو کے کچھ چپکے سے شرمائے بہت

نیچی آنکھیں ہم اس کو دیکھا کیے　　کبھو اونچی نگاہ کرتے تھے

اس عاشق کے یہاں عشق محض دل کی لگی نہیں بلکہ اس کے تمام تر احساسات اور تصورات یہاں تک کہ رویے اسی جذبہ عشق کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ بہت سے اشعار میں عشق ایک مکمل مسلک، عقیدہ اور طرزِ حیات کے طور پر ملتا ہے۔ساکنِ کوچۂ دلدار کے کل عالم سے بے نیاز ہونے والا استغنیٰ، آستانۂ یار کو کعبہ وقبلہ سمجھنا اور یا محبت کہہ کر زندگی کی ہر مشکل کو جھیل جانے کی صلاحیت اسی لیے جنم لیتی ہے کہ اس کے ہاں عشق ایک مذہب کا درجہ رکھتا ہے۔

عشقِ خوباں کو میر میں اپنا　　کعبہ و قبلہ و امام کیا

سخت کافر تھا جن نے پہلے میرؔ　　مذہبِ عشق اختیار کیا

مثالیت پسندی کے ساتھ ساتھ اس عاشق کے کردار میں بہت سی خصوصیات ہمارے آپ کے لیے بہت مانوس بھی ہیں عشق ہر فرد کا مسلک اور عقیدہ تو نہیں ہوتا لیکن میر کا یہ عاشق محض مثالی خصوصیات کا حامل نہیں بلکہ اس کے یہاں ہمیں عام انسانی عشق کی کیفیات کے بھی سبھی رنگ ملتے ہیں۔مثال کے طور پر عشق کی بے مثال بے تابی اور بے قراری میرؔ کے اس کردار کی بہت مانوس اور انسانی کیفیت ہے جسے میرؔ نے سو رنگ سے باندھا ہے۔

ہاں خدا مغفرت کرے اس کو　　صبر مرحوم تھا عجب کوئی

آن میں کچھ ہیں آن میں کچھ ہیں　　تحفۂ روزگار ہیں ہم بھی

ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

جب ترا نام لیجیے تب چشم بھر آوے　　اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آوے

میر کے عاشق کی دل موہ لینے والی خصوصیت بے خودی عشق کی کیفیت ہے۔باولا سا پھرنا، بے خود سا رہنا، منہ کسی کا تکنا، بات کسی سے کرنا، یہ عاشق جز وقتی عاشق نہیں۔اسی لیے اس کا انہماک اور وارفتگی دیدنی ہے عشق اس کے لیے قال نہیں حال کی حیثیت رکھتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو　　دیر سے انتظار ہے اپنا

میر کا عاشق متوسط طبقے کا عزت دار ہے اور اس کا عشق چلمنوں کی اوٹ سے اور بام و دَر سے چھپ لک کے دیکھنے دکھانے کا ہے۔ لہٰذا صاف ظاہر ہے کہ ذلت اور خواری تو ہر طرح کی اس کا مقدر بنتی ہوگی میر اسے اپنا نصیب سمجھ کر قبول کرتے ہیں اور عزتِ سادات لُٹ جانے کا قلق رکھنے کے باوجود عشق کرتے ہیں۔ اس عشق میں یہ خواری دوطرفہ ہے۔ ایک تو سماجی اور طبقاتی دوسری ذاتی اور جسمانی جس میں خواہش کی بے امانی در بدر کراتی ہے لیکن سوائے ناکامی کے کچھ حاصل نہیں اور یوں ذلت کا سامان مزید بڑھ جاتا ہے۔

بدنامی کیا عشق کی کہیے رسوائی سی رسوائی ہے　　صحرا صحرا وحشت بھی تھی، دنیا دنیا تہمت تھی

میر کا یہ عاشق محض ذلیل و رسوا ہی نہیں بلکہ غیور بھی ہے۔ ایک سچائی شعار عاشق کے یہاں غیرت عاشقی کے احساس کا پیدا ہونا فطری ہے کیونکہ محبت اس کے نزدیک محض کار برآری، اپنا مطلب پورا کرنا اور ہوا و ہوس کی تسکین نہیں۔ معشوق کا مثالی حد تک احترام کرنے والے اس عاشق کا اپنا تصور ذات اور عزتِ نفس کا احساس بھی ہے محبوب کی کج روی اور غیر انسانی رویے پر یہ عاشق روٹھ جانے کا حربہ استعمال کرتا ہے۔

غیرت سے نام اس کا آیا نہیں زباں پر　　آگے خدا کے جب ہم محوِ دعا ہوئے ہیں

عشق کا انجام مختصراً موت ہے، عاشق یہ بات جانتا ہے اگر چہ وہ خوف زدہ نہیں لیکن یہ بات اُسے حیران ضرور کرتی ہے کہ آخر عشق کا چلن ایسا کیوں ہے کہ اس کی گلی میں جا کر لہو میں نہانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس مرض کا کوئی چارہ گر نہیں۔ یہ وہ مرض ہے جس میں نا اُمیدی ہو جاتی ہے لیکن عاشق سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس راہ پر چلنے سے گریز نہیں کرتا۔

بہت آرزو تھی گلی کی تری　　سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار　　عشق کی کون انتہا لایا

میر کے عاشق کو لوگ منکسر المزاج عاشق سمجھتے ہیں اصل میں یہ مغالطہ ہوا کہ میر کا لہجہ عام طور پر دردمندانہ ہوتا ہے اور عشق میں تو معاملہ محبوب سے ہوتا ہے اور پھر میر کے ہاں گدازِ عشق اس قدر ہے کہ انہوں نے محبوب سے جو بھی بات کی وہ التجا بن گئی، فریاد بن گئی اور فغاں کی ہم آمیز درخواست بن گئی۔ میر نے نہایت دردمندی کے ساتھ محبوب کو التفات کی طرف مائل کیا۔ میر اپنی انسانی آرزوؤں کے پورا کرنے کے لیے محبوب کو طعن آمیز انداز میں قائل نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس التجا کے انداز میں لطفِ زبان پیدا کرنا، بیمار داری کرنا، میر خستہ کو پیار کا ایک لفظ عطا کرنا، ان سب التجاؤں پر عاشق کی حیات کا دارومدار ہے۔ یہ عاشق اپنی بے چارگی، خستگی، نیم جانی کے واسطے دے کر محبوب کے لطف و عنایت کی درخواست کرتا ہے۔ کبھی اس کے حسن کا واسطہ بھی دیتا ہے۔

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے　　کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

حاصلِ دو جہان ہے اک حرف ہو میری جان آگے تم مختار
غیر ہی مورد عنایت ہے ہم بھی تو تم سے پیار رکھتے ہیں
حسن تو ہے ہی کرو لطفِ زباں بھی پیدا میر کو دیکھو کہ سب لوگ بھلا کہتے ہیں
چشم پوشی نہ کر ، فقیر ہے میر مہر کی اس کو اک نظر ہے بس
کچھ تمہی ملنے سے بیزار ہو میرے ورنہ دوستی ننگ نہیں ، عیب نہیں ، عار نہیں
ناز و انداز و ادا ، عشوہ و اغماض و حیا آب و گل میں ترے سب کچھ ہے یہی پیار نہیں
نہ باتیں کرو سرگرانی کے ساتھ مری زیست ہے مہربانی کے ساتھ

پروفیسر حسن عسکری نے میر کے عاشق کی چند خصوصیات انسانی پر اس حد تک زور دیا ہے کہ جوش جذبات میں یہ تک لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے محبوب سے محبت تک کا طلب گار نہیں حالاں کہ میر کے عاشق کا جی ''کیا کیا کچھ'' چاہتا ہے۔اس کا بیان کرنے پر معلوم ہوگا کہ میر کے عاشق کے یہاں ایسی آرزوؤں کی ایک دنیا آباد ہے جن کا تعلق لذتِ جسم و بدن سے ہے۔دیدار سے لے کر گلے لگ کر سونے تک سب آرزوئیں جس عاجزی اور لہجے کی کپکپاہٹ میں بیان ہوتی ہیں اسے دیکھ کر صاف لگتا ہے کہ اگر ادھر سے انکار ہوا تو پھر ''سدا میں تو رہتا ہوں بیمار سا'' والی حالت میر کی ہو جائے گی۔

آج ہمارے گھر آیا تو کیا ہے یاں جو نثار کریں اِلا کھینچ بغل میں تجھ کو دیر تلک ہم پیار کریں
تم کہو میر کو چاہو کہ چاہیں ہیں تمہیں اور ہم لوگ تو سب ان کا ادب کرتے ہیں

وصل کی آرزو سبھی عاشق کرتے ہیں لیکن میر کے یہاں اس آرزو کے پورا ہونے پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔ شوق کی افراط ان کے یہاں جس اضطراب کو جنم دیتی ہے وہ اس کے ہاتھوں بیمار ہو جاتے ہیں۔ایسے عاشق کی آرزوئے وصل قرین قیاس ہونی چاہے جو ایک یاقوتی لب کے مل جانے پر زندہ ہو جاتا ہے۔یوں لگتا ہے اس نے زندگی میں کوئی اور چیز مانگی ہی نہیں۔صرف ایک بات کی تمنا کی ہے۔وہ زندگی کے آشوب اور آزار کو بوسۂ لب اور آغوش بھرنے کی قیمت پر سہہ رہے تھے۔اس لیے صرف وصل ان کے لیے حاصلِ دو جہاں ہے۔وصل اس عاشق کے لیے ساری عمر پر محیط ہجر کی اندوہ ناکی کا ایک ایسا علاج ہے جیسے کوئی بیمار شفا پا جائے یا مرنے والے کو نئی زندگی مل جائے۔

وصل اُس کا خدا نصیب کرے میر جی چاہتا ہے کیا کیا کچھ

عشق سارا ہی اصل میں ہجر ہے۔وصل تو آرزو ہی کی بات زیادہ تر رہتی ہے۔میر کے اس کردار کے یہاں کیفیات ہجر کو بہت شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ہجر اس کے نزدیک ایک آگ ہے جس میں اس کا سارا بدن جل رہا ہے۔ہجر کی کوفت کے سبب اس عاشق کا جی نہ گھر میں لگتا ہے نہ باہر بس بے تابی کی حالت ہوتی ہے لیکن ہجر میں

محبت کو سلامت رکھنا اسی کردار کی ہمت ہے

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا — گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

اُٹھ گیا میر وہ جو بالیں سے — پھر مری جان مجھ میں کچھ نہ رہا

بے قراری، بے دماغی، بے کسی، بے طاقتی — کیا جیے وہ جس کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

عاشق کے اس کردار کی ایک نمایاں ترین خوبی عشق میں استواری اور ثابت قدمی کی ہے۔ اس عاشق کے لیے کوئے یار سے اُٹھ کر کسی اور طرف جانا ممکن نہیں ہے۔ خواہ سر پر کیسی ہی قیامت ہو یا زندانی و زنجیری ہونا پڑے۔ آستانۂ یار پر ناصیہ فرسا عاشق جنت کو بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتا۔ عشق و ہوس میں امتیاز، استقامت سے ہی ہو سکتا ہے۔ میر کے کبیر ہونے پر بھی ان کا معمول ترک نہیں ہوا۔ اس لیے کہ عشق اس عاشق کے لیے ایک مکمل لائحۂ حیات اور طرزِ زندگی ہے۔

سر مارنا پتھر سے یا ٹکڑے جگر کرنا — اس عشق کی وادی میں ہر نوع بسر کرنا

مستی، حسن پرستی، رندی، یہی عمل ہے مدت سے — میر کبیر ہوئے تو کیا ہے چھوٹے ہے معمول کوئی

عشق کرنا نہیں آسان بہت مشکل ہے — چھاتی پتھر کی ہے ان کی جو وفا کرتے ہیں

جو راہِ دوستی میں اے میر مر گئے ہیں — سر دیں گے لوگ ان کے پا کے نشاں کے اوپر

حواشی و حوالہ جات

۱۔ ''غالب آشفتہ نوا'' از ڈاکٹر آفتاب احمد، پیش لفظ از پروفیسر کرار حسین، ص ۹، انجمن ترقی اُردو، کراچی، اشاعت اول، ۱۹۸۹ء

۲۔ اس مقالے میں اشعار میرؔ کے حوالہ جات کے لیے ظل عباس عباسی صاحب کی مرتبہ ''کلیات میر'' جلد اول، شائع کردہ قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، حکومت ہند، نئی دہلی، دوسرا ایڈیشن، ۲۰۰۳ء، کو استعمال کیا ہے۔

۳۔ ''غالب آشفتہ نوا''، از ڈاکٹر آفتاب احمد، ص ۱۰-۱۱۔

۴۔ ''انسان اور آدمی''، مشمولہ ''مجموعہ حسن عسکری''، از محمد حسن عسکری، ص ۱۵۴، سنگ میل، لاہور، ۱۹۹۴ء۔

۵۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۹۲۲، ص ۵۲۰۔

۶۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۵۹، ص ۳۱۰۔

۷۔ دیوان اول، غزل نمبر ۵۰۰، ص ۳۶۱۔

۸۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۲۱۹، ص ۶۳۱۔

۹۔ دیوان اول، غزل نمبر ۱۳، ص ۱۸۷۔

۱۰۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۱۰۵۰، ص ۵۶۹۔

۱۱۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۶۲، ص ۳۱۱۔

۱۲۔ دیوان اول، غزل نمبر ۴۲۳، ص ۳۳۳۔

۱۳۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۱۰۰۲، ص ۵۵۱۔

۱۴۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۸۰۱، ص ۴۷۰۔

۱۵۔ دیوان اول، غزل نمبر ۵۸، ص ۲۰۵۔

۱۶۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۱۸۵، ص ۶۲۰۔

۱۷۔ ''انسان اور آدمی''، مشمولہ ''مجموعہ حسن عسکری''، از محمد حسن عسکری، ص ۱۵۸۔
۱۸۔ ''وقت کی راگنی''، از محمد حسن عسکری، ص ۲۱۱، مکتبہ محراب، لاہور، اول ۱۹۷۹ء۔
۱۹۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۱، ص ۱۹۵۔ ۲۰۔ دیوان اول، غزل نمبر ۲۵۸، ص ۲۷۲۔
۲۱۔ دیوان اول، غزل نمبر ۲۹۵، ص ۲۸۶۔ ۲۲۔ دیوان اول، غزل نمبر ۱۰۷، ص ۲۲۳۔
۲۳۔ دیوان اول، غزل نمبر ۵۴۸، ص ۳۷۹۔ ۲۴۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۶۰، ص ۳۱۰۔
۲۵۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۵۹، ص ۳۱۰۔ ۲۶۔ ''وقت کی راگنی''، محمد حسن عسکری، ص ۲۱۴۔
۲۷۔ دیوان اول، غزل نمبر ۸۰، ص ۲۱۳۔ ۲۸۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۸۰، ص ۳۱۷۔
۲۹۔ ''شعر شور انگیز'' (جلد اول) از شمس الرحمٰن فاروقی، ص ۱۱۲، ترقی اُردو بیورو، نئی دہلی، اول ۱۹۹۰ء۔
۳۰۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۳۴۱، ص ۶۷۶۔ ۳۱۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۸۸، ص ۳۲۰۔
۳۲۔ دیوان اول، غزل نمبر ۲۱۳، ص ۲۵۷۔ ۳۳۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۸۸۷، ص ۵۰۵۔
۳۴۔ دیوان اول، غزل نمبر ۵۲۲، ص ۳۶۹۔ ۳۵۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۴۵۷، ص ۷۱۱۔
۳۶۔ دیوان پنجم، غزل نمبر ۱۵۳۷، ص ۷۳۸۔ ۳۷۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۳۵۸، ص ۶۸۱۔
۳۸۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۴۷۴، ص ۷۱۶۔ ۳۹۔ ''انسانی تعلقات کی شاعری''، مشمولہ ''شعر شور انگیز''، جلد اول، ص ۱۲۷
۴۰۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۱۴۵، ص ۶۰۶۔ ۴۱۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۲۹۳، ص ۶۵۷۔
۴۲۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۳۱۷، ص ۶۶۹۔ ۴۳۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۲۵۴، ص ۶۴۳۔
۴۴۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۰۶۴، ص ۵۷۸۔ ۴۵۔ دیوان دوم، غزل نمبر ۶۸۶، ص ۴۲۶۔
۴۶۔ دیوان سوم، غزل نمبر ۱۲۶۹، ص ۶۴۸۔ ۴۷۔ دیوان پنجم، غزل نمبر ۱۶۹۲، ص ۷۸۵۔
۴۸۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۴۶۲، ص ۷۱۲۔ ۴۹۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۴۹۳، ص ۷۲۲۔
۵۰۔ دیوان چہارم، غزل نمبر ۱۴۹۹، ص ۷۲۴۔ ۵۱۔ ''شعر شور انگیز''، شمس الرحمٰن فاروقی، جلد اول، ص ۱۳۸۔
۵۲۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۸۹، ص ۳۲۱۔ ۵۳۔ دیوان اول، غزل نمبر ۴۲۹، ص ۳۳۶۔
۵۴۔ ''میر تقی میر، حیات اور شاعری''، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ص ۳۳۸، انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ، ۱۹۵۴ء۔
۵۵۔ دیوان اول، غزل نمبر ۷، ص ۱۸۵۔ ۵۶۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۸۴، ص ۳۱۸۔
۵۷۔ دیوان اول، غزل نمبر ۴۳۵، ص ۳۳۸۔ ۵۸۔ دیوان اول، غزل نمبر ۴۶۰، ص ۳۴۶۔
۵۹۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۹۴، ص ۳۲۴۔ ۶۰۔ دیوان اول، غزل نمبر ۳۳، ص ۱۹۵۔